اُردو زبان اور تحریکِ آزادی

ماجد مشتاق

Majid Mushtaq

Lecturer, Department of Urdu,

Govt. College University, Faisalabad.

محمد صفدر ضیائی

Muhammad Safdar Zia'ee

M.Phil Scholar, Department of Urdu,

Govt. College University, Faisalabad.

Abstract:

Language is a major Phenomenon in the history of the nations. Language can change the dianamics and history of a nation. Urdu langugae has a major role in the history of Pakistan as well as creation of Pakistan. This article represents the history of Urdu langugae and its role in Pakistan movement. This article will also describe the thoughts of the writer's and poet's efforts for the language and movement of Pakistan.

برصغیر کی زبانوں میں اردو ایک اہم اور قدیم زبان ہے۔اُردو زبان کا خمیر مختلف زبانوں سے مل کر بنا جن میں عربی اور فارسی زیادہ اہم ہیں۔علاوہ ازیں ترکی، سنسکرت، پنجابی اور دیگر زبانوں کے الفاظ بھی اس زبان میں رائج ہیں۔دنیا کی دیگر اقوام کی طرح اُردو بولنے والوں کی اپنی زبان سے جذباتی وابستگی رکھتے ہیں۔

عربی اور اردو زبان کا آپس میں رشتہ اس وقت قائم ہونا شروع ہوا جب عرب تاجر اور شہسوار برصغیر میں اپنے مقاصد کے لیے داخل ہوئے۔ذاتی امور کی بنا پر زبان کا اشتراک ہوا جس کے زیرِ اثر اردو کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ ہونا شروع ہوا اور زبان کو فروغ ملنے لگا۔دیگر زبانوں کے اردو میں ورود کے حوالے سے بھی اس کے دامن میں وسعت پیدا ہوئی۔اردو زبان کے فروغ میں کارفرما عوامل میں غیر ادرا کی طور پر جو عوامل اثر انداز ہو رہے تھے ان میں عوام کی زبان سے والہانہ جڑت، زبان میں عوامی اور مقامی زبانوں کے الفاظ کا بے ساختہ استعمال اور لہجوں کی قبولیت زیادہ اہم تھے۔اس زبان کی سب

سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے دیگر زبانوں کے الفاظ کو من وعن اپنے اندر ضم کر کے اپنا حصہ بنا لیا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں:

> ''انشا نے دریائے لطافت میں ایک بڑے پتے کی بات کہی ہے وہ لکھتے ہیں کہ جو لفظ اردو زبان میں آ گیا ہے وہ اردو ہے خواہ اصل کچھ ہو اور جس طرح اردو میں بولا جاتا ہے اسی طرح صحیح ہے چاہے از روئے اصل اس کا یہ استعمال غلط ہو اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ وہ تمام الفاظ و لغات جو اردو میں آ گئے اور دخیل ہو گئے اردو ہیں۔''(۱)

اردو زبان کو بہت سی خوبیوں کی بنا پر عوام الناس میں مقبولیت اور لینگوا فرانکا ہونے کی سند ملی۔ ان میں سے زبان کی ایک نمایاں خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں دیگر زبانوں کے الفاظ سما کر خود اسی زبان کا حصہ بن جاتے ہیں اور قاری انہیں بغیر کسی اجنبیت کے زبان زدِ عام بھی کر لیتا ہے۔ زبانیں عوام کے لیے ہوتی ہیں اور عوام ہی انہیں مقبول کرتے ہیں ان کے لیے مکانی سرحدیں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں بن سکتیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے کہا تھا:

> ''اردو قیدِ مقام سے آزاد ہے۔ کبھی پنجاب کے لہلہاتے سبزہ زاروں میں اس نے بچپن گزارا اور کبھی دلّی کی گلیوں اور بازاروں میں اسے پھرتے دیکھا گیا۔ اس کی جوانی کی اٹھان دکن اور گجرات میں ہوئی۔''(۲)

انسان کی بنیادی ضروریات میں سے ایک ہم ترین ضرورت اظہار بھی ہے اور یہ انسان کی سب سے بڑی مجبوری بھی ہے، کیونکہ انسان معاشرے کا رکن ہے جس کے ساتھ نباہ کرنے کے لیے اسے روابط بحال رکھنے کی ضرورت پیش آتی ہے اور اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کسی ایسے عمل کی ضرورت تھی جو انسان کی بات کو ابلاغ کی سند سے نواز سکے، گویا وہ عمل ابتدا میں اشاراتی زبان قرار پایا جو انسان کی تہذیبی بالیدگی کے ساتھ ساتھ علامات، حروف، الفاظ اور گفتگو تک آن پہنچا۔ عصرِ حاضر میں زبانیں انسان کی اسی بنیادی ضرورت کو پورا کر رہی ہیں۔ ڈاکٹر نصیر احمد خان رقم طراز ہیں:

> ''زبان انسان کے خیالات کی ترسیل کا سب سے زیادہ مستعمل اور ترقی یافتہ ذریعہ ہے۔ اس بیان کے مضمرات بہت دلچسپ ہیں۔ ترسیل کا مطلب ہے کہ کسی قسم کی معلومات کو دوسروں تک پہنچانا یا کسی مقصد کے تحت مرسل الیہ (Receiver) کو پیغام دینا۔ زبان میں مبدا ابلاغ (Source) اور مرسل الیہ دونوں

انسان ہوتے ہیں اور جو پیغام دیا جاتا ہے وہ یا تو ہوا کی لہروں کے ذریعے بول کر یا کاغذ وغیرہ پر تحریر کے ذریعے دوسروں تک پہنچایا جاتا ہے۔'' (۳)

اردو زبان اور آزادی کے تقاضے

اکبر کی شاعری اپنے دور کی سماجی، سیاسی، تہذیبی اور تمدنی روایتوں کی آئینہ دار ہے۔ وہ مشرقی اقدار کے نہ صرف محافظ تھے بلکہ مغربی اقدار کے فروغ اور برطانوی راج سے متنفر تھے۔ اکبر الٰہ آبادی انگریز کے سرکاری ملازمہ ہوتے ہوئے اپنا مؤقف نہایت جرأت مندی سے بیان کرتے رہے۔ نظم ''مستقبل'' سے چند اشعار دیکھیے:

یہ موجودہ طریقے راہی ملک عدم ہوں گے
نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گی
نہ خاتونوں میں رہ جائے گی یہ پردے کی پابندی
نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجب روئے صنم ہوں گے
عقائد پر قیامت آئے گی ترمیم ملت سے
نیا کعبہ بنے گا مغربی پتلے صنم ہوں گے
تمھیں اس انقلاب دہر کا کیا غم ہے اے اکبر
بہت نزدیک ہے وہ دن، نہ تم ہوگے نہ ہم ہوں گے (۴)

اکبر الٰہ آبادی آزادی کے خواہاں تھے۔ اسی لیے ان کے کلام میں اس نوعیت کے افکار واضح دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی تحریک آزادی کے وقت مذہبی اتحاد، یگانگت' بھائی چارہ اور آزادی کی ایسی گونج اردو شاعری میں سنائی دیتی ہے جو ہندوستان میں ہونے والے انقلاب کی راہ ہموار کر رہی تھی۔

اردو ادب نے تحریک آزادی اور جدوجہدِ آزادی میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا، شعرا اور ادبائے اردو نے اپنے کلام اور فن پاروں کے ذریعے حصولِ آزادی میں حصہ لیا۔ اکبر الٰہ آبادی کے علاوہ اقبال اور ظفر علی خان نے اپنی نظموں کے ذریعے جب کہ منٹو' پریم چند' بیدی' کرشن چندر' خدیجہ مستور اور قرۃ العین حیدر نے اپنے ناولوں اور افسانوں کے ذریعے عوام میں آزادی کی لہر پیدا کی۔

اقبال نے ہندوستانی قوم میں اپنی نظموں کے ذریعے حب الوطنی کو فروغ دیا، جس سے آزادی کی قومی جدوجہد میں بڑی قوت ملی تھی۔ ایسی نظموں میں ہمالہ، تصویر درد، ترانہ ہندی، نیا شوالہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ وہ قومی اتحاد و قومی یکجہتی کے حامی تھے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے تحریک آزادی کی جدوجہد بڑی غور وفکر سے جانچا تھا۔ جس کا اندازہ جگہ جگہ ان کی شاعری میں ملتا ہے:

رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستان مجھکو
کہ عبرت خیز ہے ترا فسانہ سب فسانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاو گے اے ہندوستان والو!
تمہاری داستان تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اقبال کے ہاں انسانِ کامل، مردِ درویش، فکرِ فردا جیسے موضوعات کی بھرمار موجود ہے۔ان کی شاعری سے قاری مستقبل پسندی کا رجحان تو حاصل کرتا ہے۔ڈاکٹر اسلم انصاری لکھتے ہیں:

''اردو شاعری کی تاریخ میں اقبال سے پہلے کسی شاعر کے ہاں مستقبل پسندی کے واضح اور مستقل رُجحانات کا سُراغ نہیں ملتا۔''(۵)

جب گاندھی جی نے تحریک عدم تعاون چلائی تو حسرت موہانی اور مجاز لکھنوی جیسے وطن پرستوں کی شاعری نے بھی عوام کی بیداری میں اپنا کردار ادا کیا:

جلال آتش برق شہاب پیدا کر
ازل بھی کانپ اٹھے وہ شباب پیدا کر
تو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر
جو ہو سکے تو خود انقلاب پیدا کر(۶)

مولانا آزادؔ، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا حسرتؔ موہانی کی تقاریر عوام میں آزادی کا جذبہ جگانے میں کارگر ثابت ہوئیں۔جنگ آزادی نے جس نئے انداز کو پروان چڑھایا تھا اس وقت قلم سے تلوار کا کام لینا وقت کا اہم تقاضا تھا۔انہی حالات کے پیش نظر اُردو کے ادباء نے اپنے قلم کا رُخ تحریکِ آزادی کی طرف موڑ دیا۔اردو کی منظوم شاعری میں یہ جذبہ زیادہ واضح اور مستحکم نظر آتا ہے۔جدو جہد آزادی کے زمانے کی تخلیق کردہ بیشتر نظموں میں حب الوطنی اور آزادی کا تصور بہت واضح نظر آتا ہے۔ کرنل ہالرائڈ اور محمد حسین آزاد کی کاوشوں نے پنجاب میں نظم جدید کی تحریک کو فروغ دیا، دیگر نظم گو شعرا میں حالیؔ، شبلی نعمانی، محمد حسین آزادؔ، جوش ملیح آبادی، حسرت موہانی، اسمٰعیل میرٹھی، سرور جہاں آبادی، برج نرائن چکبست، علی سردار جعفری، فیض احمد فیض وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔

حالیؔ کی نظمیں اردو شاعری میں خاموش انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔انہوں نے تحریکِ آزادی سے متاثر ہوکر ''حب وطن'' جیسی مثنویاں تحریر کیں۔ان کے اس نظریہ سے متاثر ہوکر نظم نگاروں کی ایک بڑی جماعت نے آزادی اور حب الوطنی کے تصور کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔آزادی کی تحریک مستحکم ہوئی تو اردو شعرا نے قلم کو آزادی کے حصول کے لیے آلۂ کار بنایا:

اے وطن اے میرے بہشت بریں
کیا ہوئے تیرے آسماں و زمیں
رات دن کا وہ سماں نہ رہا
وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا
بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو
اٹھو اہل وطن کے دوست بنو
تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر
نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
قوم جب اتفاق کھو بیٹھی
اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی
چھوڑو افسردگی کو جوش میں آؤ
بس بہت سوئے اٹھواب ہوش میں آؤ

محمد حسین آزادؔ نے شاعری کی بجائے نثر میں اپنا مؤقف بیان کرنا زیادہ مناسب خیال کیا لیکن آزادی کے موضوعات کے حوالے سے انہوں نے نظم کا سہارا بھی لیا۔ آزاد اور حالی نے انجمن پنجاب کے جلسوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنی نظموں کے ذریعے ہندوستانیوں کے دلوں میں آزادی کے جذبوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ آزادؔ اپنی نظموں کے ذریعے ہم وطنوں کو محبت، اتحاد، دوستی اور امن کا پیغام دیتے ہیں:

الفت سے سب کے دل سرد ہوں بہم
اور جوکہ ہم وطن ہوں وہ ہمدرد ہوں بہم
علم و ہنر سے خلق کو رونق دیا کریں
اور انجمن میں بیٹھ کے جلسے کیا کریں
لبریز جوش حب وطن سب کے جام ہوں
سرشار ذوق و شوق دل خاص و عام ہوں

حسرت موہانی نے اپنی زندگی جدوجہد آزادی کے لیے وقف کر دی تھی۔ وہ صرف اور صرف آزادی ملک کے خواہاں تھے کسی منصب کے نہیں۔ وہ بیک وقت نڈر سیاست دان، شاعر، ادیب، صحافی اور نقاد تھے۔ ان کے تلخ اور ترش صحافتی رویے سے خوفزدہ ہو کر انگریزی حکومت نے حسرت موہانی کو دو سال کی قیدِ سخت اور پانچ سو روپے جرمانہ پابندِ سَلاسِل کر دیا، لیکن ان کی حُریت پسندی اور حُب الوطنی کے جذبات شعری پیکر میں ڈھلتے رہے۔ تنگی قید سے حسرتؔ کے پائے ثبات میں ذرا بھر لغزش نہ آنے پائی:

رُوح آزاد ہے خیال آزاد
جسم حسرت کی قید ہے بے کار
ہم قول کے صادق ہیں اگر جان بھی جاتی ہو
واللہ کبھی خدمتِ انگریز نہیں کرتے
غربت کی صبح میں نہیں ہے وہ روشنی
جو روشنی کہ شام سوادِ وطن میں تھی

سیاسی و مذہبی اکابرین اور شعرا و ادبا کی کاوشوں سے جو تحرک اور جذبہ پیدا ہوا تھا اس کے بل بوتے پر آزادی تو حاصل ہوئی لیکن خون میں ڈوبی ہوئی زمین سے آسمان تک فرقہ واریت کا زہر بھر گیا۔ تعصب اور تنگ نظری کی آگ اتنی بھڑکی کہ صدیوں کا تہذیبی سرمایہ اس میں فنا ہونے لگا۔ ہندو مسلم ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوگئے۔ درندگی، سفاکی اور بربریت کی وحشی طاقتیں بے لگام ہوگئیں ۔ان حالات میں پھر سے تشویش ناک صورت نے جنم لیا۔فیض کی ''صبح آزادی'' میں یہ بجھی بجھی اور درد کی لہر ان مصروں میں ہمیشہ کے لیے مجسم ہوگئی ہے:

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہوگا شب سست موج کا ساحل
کہیں تو جاکے رکے گا سفینۂ غم دل

جوش ملیح آبادی نے آزادی کے موضوع پر بڑے واضح اور واشگاف انداز میں لکھا جس کی وجہ سے ''شاعرِ انقلاب'' کہلائے۔ ان کی نظمیں سماجی اور سیاسی انتشار کی شاخسانہ ہے۔ان کا کلام بڑے واضح مفہوم کا حامل اور انقلابی نعرہ بازی سے لبریز ہے۔اُن کے پُر جوش اور ولولہ انگیز اندازِ بیان نے آزادی کے متوالوں کو سربکف ہونے پر آمادہ کیا:

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب انقلاب

جوشؔ آزادی کی تحریکوں سے متاثر تھے اسی وجہ سے ان کے ہاں بے باکی اور جذباتیت کی فضا ملتی ہے۔ان کی نظموں کے موضوعات میں نسلی منافرت، سیاسی غلامی، قومی نفاق اور معاشی جبر و استحصال شامل ہیں۔ ملک کو غلامی کے چنگل سے نکالنے کے لیے وہ ہمیشہ کوشاں رہے۔ جب تحریک آزادی زوروں پر تھی تو انھیں کامل یقین ہوگیا کہ اب ملک آزاد ہو جائے گا۔اس کے بعد کی نظمیں ان کے اس یقین کا ثبوت پیش کرتی ہیں جن میں حب الوطنی، تمانیت اور تمکنت کا احساس بیدار ہوتا ہے۔نظم'' شکست زنداں کا خواب

''سے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے، گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں
بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے، توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے، دم توڑ رہی ہیں تدبیریں
کیا ان کو خبر تھی؟ سینوں سے جو خون چرایا کرتے تھے
اک روز اسی بے رنگی سے جھلکیں گی ہزاروں تصویریں
سنبھلو! کہ وہ زنداں گونج اٹھا جھپٹو! کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اٹھو! کہ وہ بیٹھیں دیواریں، دوڑو! کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں

جوش نے ملک وقوم کی محکومی، معصوم انسانوں کے قتل و غارت گری کا مشاہدہ کیا۔ وہ آزادی، مساوات اور انسان دوستی میں یقین رکھتے تھے۔ انہوں نے حصولِ آزادی کے لیے لڑی جانے والی جنگوں کو ایک خاص زاویے سے دیکھا اور اس سے اپنی فکری استعداد کے مطابق نتیجہ اخذ کیا۔ قاسم یعقوب اس حوالے سے ذکر کرتے ہیں:

''جوش نے ۵۶ء کی جنگ کو خاص زاویے سے دیکھا، وہ صرف ممالک کے درمیان عسکری مقابلہ بازی نہیں دیکھ رہے تھے بلکہ حق و باطل میں بپا معرکہ تصور کر رہے تھے۔''(۷)

ان کی نظموں میں انگریز سامراج سے نفرت کے عناصر کی بھرمار ہے۔ ان کی نظم ''بغاوت'' میں مجاہدانہ تیور، فرنگی حکومت کو للکارنے اور سامراجی نظام کو تاراج کرنے کی دلالت کرتا ہے:

ہاں بغاوت ! آگ بجلی موت آندھی میرا نام
میرے گرد و پیش اجل ، میری جلو میں قتل عام
زرد ہو جاتا ہے میرے سامنے روئے حیات
کانپ اٹھتی ہے میری چین جبیں سے کائنات
رعب سلطانی سے یہ چہرہ اتر سکتا نہیں
جو خدا سے پڑا ، شاہی سے ڈر سکتا نہیں

پنڈت رام پرشاد بسمل کی شاعری نے نہ صرف آزادی کے طلبگاروں کے حوصلے بُلند کیے بلکہ انگریزی حکومت کی بنیاد کو بھی ہلا ڈالا۔ کاکوری میں سرکاری خزانہ بردار گاڑی کو لوٹنے کے جرم میں رام پرشاد بسمل کو ۱۹ دسمبر ۱۹۲۷ء کو گورکھپور جیل میں پھانسی دے دی گئی مگر ان کے جوشیلے اشعار زہریلے سانپ بن کر حکمرانوں کا تعاقب کرتے رہے۔

سر فروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے
اے شہید ملک و ملت تیرے جذبوں کے نثار
تیری قربانی کا چرچا غیر کی محفل میں ہے
وقت آنے دے بتا دیں گے تجھے اے آسماں
ہم ابھی سے کیا بتائیں کیا ہمارے دل میں ہے
اب نہ اگلے ولولے ہیں اور نہ ارمانوں کی بھیڑ
ایک مٹ جانے کی حسرت اب دلِ بسمل میں ہے

آزادی کا موضوع اس قدر اہم ہے کہ اس کے ساتھ ملک کے باشندوں کے جذبات جڑے ہوئے ہیں۔ انہوں نے جس قدر تگ ودو کر کے اسے حاصل کیا تھا اس سے کہیں زیادہ جذبے کے ساتھ اس کی حفاظت میں سرگرداں نظر آئے۔ احمد ندیم قاسمی کے کلام میں آزادی اور اس کے حصول کی سعی کے اثرات کا اظہار ملتا ہے:

مجھے تو پھول کھلانے ہیں وہ لہو کے سہی
مجھے تو قرض چکانا ہے شاخساروں کا
یہ جی میں ہے کہ شہیدوں کی طرح زندہ رہوں
میں اپنے فن کو بنا لوں دیا مزاروں کا(۸)

قاسمی اپنے جذبات کی وابستگی اور وطن سے محبت کو اپنی نظم ''وطن'' میں بیان کرتے ہیں کہ اس ملک اور نظریہ ساز ریاست کے لیے انہیں جان کا نذرانہ بھی پیش کرنا پڑا تو وہ دریغ نہیں کریں گے۔ اصل میں ان کے اشعار عوام الناس کے ان خالص جذبات کی عکاسی کرتے ہیں جو اس وقت کے حالات کے مطابق دکھائی دے رہے تھے:

اسی کی خاک سے اٹھے اسی کا حال ہیں ہم
جئیں گے اس کے لیے اور مریں گے اس کے لیے (۹)

اردو ادب میں جہاں آزادی کا موضوع خاص اہمیت کا حامل رہا ہے وہیں اردو شعرا کے نزدیک اس کے تحفظ کا مسئلہ بھی درپیش رہا جس کے لیے انہوں نے اپنے کلام کے ذریعے عام شہریوں اور افواجِ پاکستان کے حوصلوں کو ملکی تحفظ کے لیے گرمائے رکھا' اور یقیناً یہی وہ ضرورت تھی جسے آزادی کے لیے ناگزیر قرار دیا جا سکتا ہے۔ صوفی تبسم اپنی نظم ''نغمۂ وطن'' میں غازیوں کے جذبات کو جلا بخشتے ہوئے کہتے ہیں:

وہ غازی کہ تھے پاسبانِ حرم
وہ غازی کہ تھے قلب و جانِ وطن
وہ غازی کہ تھے دین کے پاسباں
یہ نشاں یہ ہمارے وطن کا نشاں(۱۰)

جس طرح صوفی تبسم کے ہاں ''غازی'' ملکی محافظ کے طور پر استعارہ ہے اسی طرح شورش کاشمیری اپنے وطن اور اس کی بقا کے لیے ہر خطرہ مول لینے اور دشمن کو نیست و نابود کرنے کا عزم رکھتے ہیں۔ان کی نظم ''میرا سب کچھ میرے وطن کا ہے'' سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

جو عدو اس زمیں پہ آئے گا
لوٹ کر پھر کبھی نہ جائے گا
مار کھائے گا سر کٹائے گا
موت مانگے گا موت پائے گا
میرا سب کچھ میرے وطن کا ہے(۱۱)

بیان کردہ تمام شعرا کے حوصلوں اور عزائم کے پیش نظر دیکھا جائے تو احسان دانش کا انداز زیادہ اطمینان بخش اور جنون کی حد تک محبت کا مظہر ہے۔وہ اپنی نظم ''دورانِ جنگ''میں تحفظِ وطن کے تقاضوں کے پس منظر میں بیان کرتے ہیں کہ اگر دشمن زیادہ طاقت ور اور ہتھیار سے لیس ہے تو بھی پروا نہیں کیونکہ وہ رحمت یزداں کے سہارے پہ عزائم جو پختگی فراہم کرتا ہے:

اس کی طرف مشین گنیں ہیں، ہوا کریں!
اپنی طرف تو رحمت ِ یزداں ہے آج کل
بھڑکا دیا ہے کفر نے للکار کر اُسے
پھر کشت و خوں، مذاقِ مسلماں ہے آج کل

مزید آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

دانش ذرا یہ موسمِ فتح و ظفر تو دیکھ
جو ہے مقابلے پر گریزاں ہے آج کل(۱۲)

قیوم نظر بھی لگ بھگ اسی تناظر میں لکھ رہے تھے لیکن ان کا اظہارِ خیال یاسیت کو جنم دیتا ہے جس میں انھوں نے عموماً سقوطِ ڈھاکہ کے حوالے سے مایوسی کا اظہار کیا ہے۔ان کے نزدیک سقوطِ ڈھاکہ ملکی سالمیت کے عدم استحکام کا نام تھا اور پھر خصوصاً وہ حالات جن میں پاکستانی فوج وہاں ایک خاص مقصد کے لیے گئی مگر پسپائی کی وجہ سے قید ہوگئی۔قیوم نظر کے ہاں یہ قید آزادی کے لیے ایک چیلنج بن کر سامنے آئی تھی۔

آزادی کے برباد ٹھکانوں میں جئیں گے
اب آتشیں توپوں کے دہانوں میں جئیں گے
پھیل رہی ہے بارود کی بو قریہ و کو میں
رکتی ہوئی سانسوں کے جہانوں میں جئیں گے(۱۳)

حوالہ جات

۱۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، ادب اور لسانیات، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۷۰ء، ص:۶۰۲

۲۔ ایضاً، ص:۴۰۲

۳۔ ڈیوڈ کرسٹل، لسانیات کیا ہے، مترجم: ڈاکٹر نصیر احمد خان، لاہور: نگارشات، ۱۹۹۷ء، ص:۴۶

۴۔ اکبرالہٰ آبادی، کلیاتِ اکبر، س ن

۵۔ اسلم انصاری، ڈاکٹر، شعر و فکرِ اقبال، لاہور: بزمِ اقبال، ۱۹۹۹ء، ص:۹۹

۶۔ مجاز لکھنوی، کلیاتِ مجاز

۷۔ قاسم یعقوب، اردو شاعری پر جنگوں کے اثرات، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۱ء، ص:۱۴۷

۸۔ احمد ندیم قاسمی، ندیم کی نظمیں، جلد اوّل، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء، ص:۸۵۴

۹۔ جنگ ترنگ، (انتخاب: شان الحق حقی)، وزارت اطلاعات، س ن، ص:۴

۱۰۔ ایضاً، ص:۹۹۳

۱۱۔ جاگ رہا ہے پاکستان، ص:۳۹۳

۱۲۔ نقش، جنگ نمبر، مرتب: شاہد احمد دہلوی، شمس زبیری، ۱۹۶۶ء، ص:۱۱۸۰

۱۳۔ قیوم نظر، قلب و نظر کے سلسلے (کلیات)، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء، ص:۴۳۷

☆......☆......☆